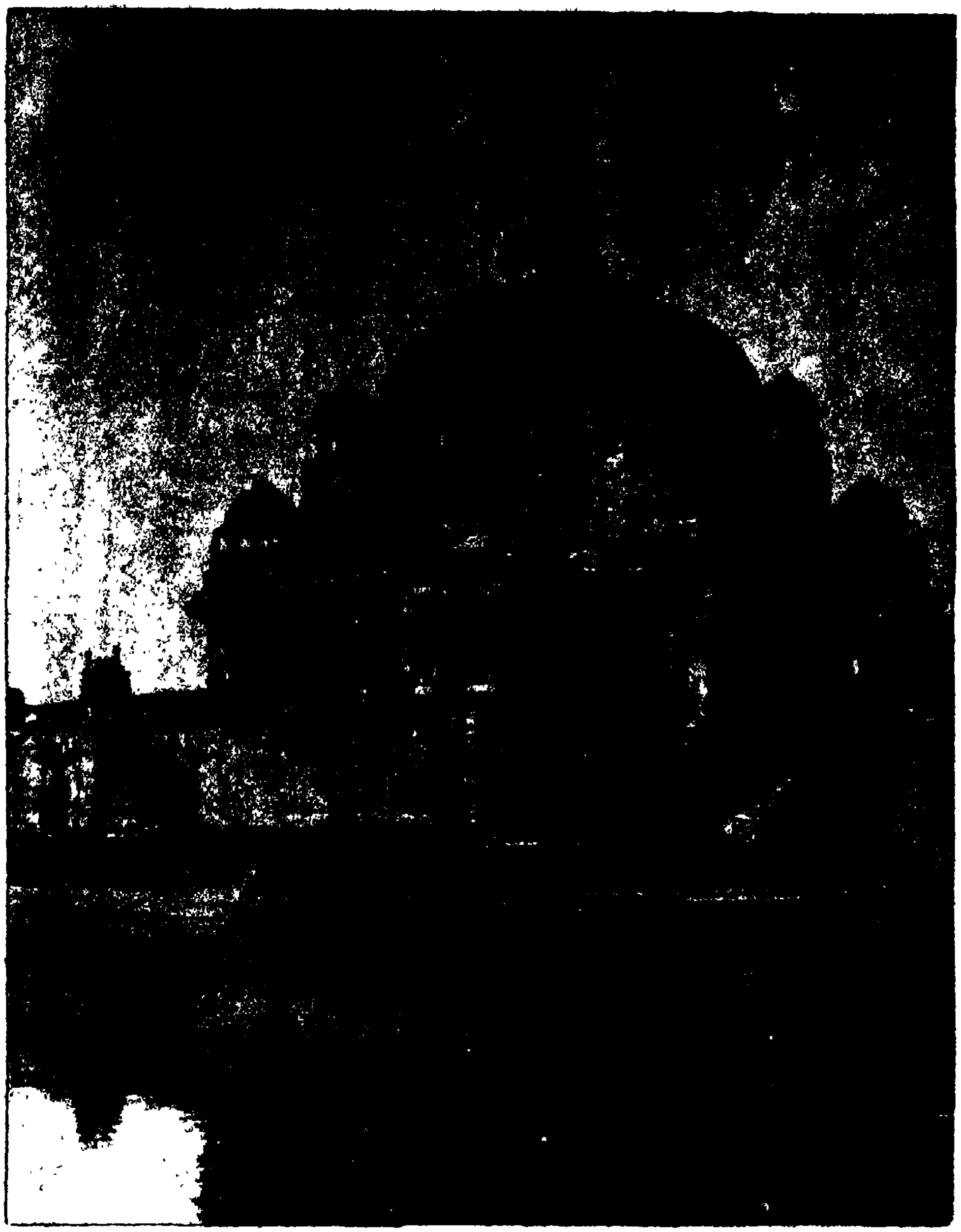
KARWAN – E – WATAN DELHI.
ANNUAL AND REPUBLIC NUMBER 1968.
R.N. No. 7452/63 REGD. No. D1699.



روضہ شیرشاہ سہسرام

—— تعمیراتِ عالم میں بے مثال گنبد ——

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم حب وطن کے معاملہ میں شیر تھے اور حب ملت کے معاملے میں بھی شیر تھے۔ شیر بے دھڑک حملے کرتا ہے اور آس پاس کے خطروں کو بھی سونگھتا ہے۔ لدھیانہ (پنجاب) ان کا وطن تھا اور دلّی ان کا دوسرا وطن تھا۔ ان کی پہلی تقریر جب دلّی دروازے (لاہور) کے باغ میں سنی تو خیال ہوا کہ وہ صرف زبان اور صرف پھیپھڑوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن کم و بیش تیس سال کے تجربے گواہ ہیں کہ ان کی زبان سے زیادہ ان کا دماغ کام کرتا تھا اور آخر عمر میں تو شاید ان کی زبان ساکت تھی اور صرف دماغ کام کرتا تھا۔ لدھیانہ کے جید علماء کے خاندان میں وہ پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے روحانی وابستگی رہی مجلس احرار اسلام کو جنم دیا اور کانگرس کے مجاہدہ حریت کو بہت بڑا محاذ سمجھا۔ اس لئے ان کی پوری زندگی کی تاریخ علماء لدھیانہ، دارالعلوم دیوبند، مجلس احرار اسلام اور کانگرس کی تاریخ ہے۔ مسلمانوں میں ان ایسے TACTICIAN یعنی سیاست کے پینترے بازیوں کو سمجھنے والے ہم نے کم ہی دیکھے۔ بساط سیاست پر سوچ کر چالیں چلتے تھے۔

ابتدا میں مولانا ظفر علی خاں کی صحافت و سیاست کے قریب آئے اس کے بعد قیادت کا خود بخود مل گیا۔ سیاسی سفر کا ایک مقام ایسا بھی آیا کہ انھیں اور ان کے دوستوں کو مجلس احرار اسلام قائم کرنا پڑی سیاسی سفر کا یہ مقام وہ تھا کہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم مرحوم کو آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ میں لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ جب ڈاکٹر عالم مجلس عاملہ کے رکن نامزد کر دیئے گئے تو مولانا اور ان کے دوستوں نے سیاست کا رخ کسی حد تک موڑ دیا۔ اس مسئلے کے علاوہ بھی کئی مسائل تھے۔ جن کا تقاضہ تھا کہ ایک نئی رہنمائی کی جائے۔ مولانا کے



رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
زمانے کے جتنے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری

احراری رفقاء میں خاص طور پر قابل ذکر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، چودھری افضل حق مرحوم کو مجلس احرار کا دماغ کہتے تھے۔ لیکن اس دماغ کو فکر اور خیال مولانا حبیب الرحمٰن سے ملتا تھا۔

مجلس احرار وطن دوستی اور ملت دوستی کا ایک صحت بخش مرکب تھی لیکن اسے تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا تھا۔ یہ راہ کبھی کبھی فرقہ پرستی کو بھی چھو سکتی تھی، لیکن ہمیں یقین ہے کہ فرقہ پرستی سے مجلس احرار کو محفوظ رکھنے میں مولانا حبیب الرحمٰن نے جو رول ادا کیا کسی احراری لیڈر نے ادا نہیں کیا مولانا اور ان کے ساتھیوں کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں تحریک کشمیر شروع کی اور ساٹھ ہزار مسلمانوں کو جیلوں میں بھیج دیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں کشمیر، اس کے لیڈروں اور کارکنوں کا انھیں کافی تجربہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ عبداللہ بخشی غلام محمد، صادق صاحب اور میر واعظ (جو اب پاکستان میں) کو جتنا پہچانتے تھے شاید ہی کوئی پہچانتا ہو۔

تقسیم ملک سے پہلے کا ان بٹا پنجاب انگریز حکومت کا چہیتا تھا۔ اسے چونکہ بہادر سپاہی جنگ کے لئے پنجاب سے ملتے تھے، اس لئے بہت سے خاندانوں کو اس نے دودھ پلا پلا کے پالا تھا اور ان افراد کی لیڈری کو پہلوان بنایا تھا جو اس کے وفادار تھے۔

پنجاب کانگرس میں چونکہ مسلمان فعال نہ تھے۔ اس لئے انگریز حکومت اور اس کے پنجابی چہیتوں کا مقابلہ کرنا مجلس احرار کا کام تھا۔ مقابلہ کی یہ جنگ جس طرح مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے لڑی وہ انہی کا حصہ تھی۔ ہندوستان

بقیہ صہ ۴۲

بقیہ حبیب الرحمٰن لدھیانوی

نے شاید ہی کسی لیڈر نے انگریز سامراج کے خلاف وہ مورچہ بندی کی ہو، جو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کی۔ انگریز حکومت اور اس کے پنجابی حلیفوں نے مولانا کو جتنا بڑا باغی، جتنا بڑا غدار سمجھا، شاید مہاتما گاندھی کو بھی نہ سمجھا ہو۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ ہندوستان کے تمام اسیران سیاسی رہا کر دیئے گئے مگر مولانا سے انگریز کو اتنا بڑا خطرہ تھا کہ انہیں رہا نہیں کیا گیا اور رہا بھی کیا تو بادل ناخواستہ کیا۔

ہندوستان کے صف اوّل کے لیڈروں سے مولانا کے گہرے رابطے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو وہ عزیز تھے۔ گاندھی جی ان کے خطوط پر دیر تک غور و فکر کرتے اور اپنے سکریٹریوں کو ہدایت کرتے کہ جواب خط میں کوئی نامناسب لفظ نہ آئے، ورنہ حبیب الرحمٰن ایک ایک لفظ پر مجھ سے برسوں لڑیں گے۔ مولانا کی حق گوئی سے گاندھی جی کے ایک سکریٹری جلد تنگ تھے اور انہوں نے کئی بار کوشش فرمائی کہ گاندھی جی اور مولانا حبیب الرحمٰن کی ملاقات نہ ہو۔

مسٹر محمد علی جناح کو مولانا حبیب الرحمٰن سے اور مولانا حبیب الرحمٰن کو مسٹر محمد علی جناح سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر جناح صاحب بھی اختلاف کے باوجود مولانا کی رائے کی قدر کرتے تھے۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ مولانا لاہور کے ممتاز ایڈیٹروں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے ان کی انگریز دشمنی پر طنز فرمایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ انگریز کی دولت مجھے دلوا دو تو میں تمہاری طرح انگریز کی مداحی کروں گا۔ ایڈیٹر صاحب لاجواب ہو گئے۔ ایک دوسرے ایڈیٹر صاحب نے (جو ہندوستان میں آج بھی موجود ہیں) مولانا سے پوچھا کیا ہندوستان میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے انگریز کی دولت نہیں خرید سکتی۔ جواب دیا کہ "صرف تین ہیں۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو اصول پسند ہیں، اس لئے انگریز ان کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے مسٹر جناح (اس زمانہ میں مسٹر جناح کا بہت زیادہ نام نہ تھا) جو اتنے شاندار ہیں کہ انگریز کو خاطر میں نہیں لا سکتے۔ تیسرے گاندھی جی جن کی دیانتداری کی قیمت انگریز سامراج کا خزانہ ادا نہیں کر سکتا۔

مولانا بہت اچھے مقرر تھے، تقریر کرتے تو مجمع پر چھا جاتے۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ وہ دانش وروں کی مجلس میں گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ یہ عوامی جلسوں کے حبیب الرحمٰن نہیں بلکہ سراپا دانش و آگہی ہیں۔

مولانا کا وطن لدھیانہ تھا۔ اس لئے تقسیم ملک کے بعد انہیں اس زمانہ کے مشرقی پنجاب ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ اور لدھیانہ کے واقعات ایسے تھے کہ وہ پاکستان جا سکتے تھے، وہاں ان کے رفقا تھے، ان کے خاندان کے ممتاز افراد تھے لدھیانہ کے کانگریسی لیڈر بھی تھے، لیکن کچھ بات ہی ایسی تھی کہ مولانا تقسیم ملک کے بعد دلی آئے اور کوچہ رحمٰن (دلی) میں ایک ایسی مسند لگائی جسے ہم تو رشد و ہدایت کی مسند ہی کہتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد دلی میں بعض لیڈروں سے انہیں اختلاف بھی تھا، لیکن اختلاف کے باوجود ان کے انداز میں غیر معمولی توازن تھا۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں کو صحیح مشورے دیئے اور سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کی۔

عمر نے وفا نہ کی، ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد ان کی جانشینی کا حق ادا کرتے۔ ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو مولانا مرکزی وزارت کے مشیر خصوصی ہوتے ارباب سیاست و کشادگی محفل کی رونق ہوتے، لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستان جب آزاد ہوا تو ہندو اور مسلمان کا سوال ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا اور اس پہاڑ کی اوٹ میں کوچہ رحمٰن کے ایک مکان ہی میں مولانا آباد ہو سکے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ایک صاحبزادے مولوی عزیز الرحمٰن ایک ابتدائی اسکول کے معلم اور نگراں ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن پنجاب ہوڑتی کی سیر فرما رہے ہیں۔ تیسرے صاحبزادے لدھیانہ میں ہیں اور کہتے ہیں کہ کامیاب ہیں دو صاحبزادے اور ہیں جو کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ سہاروں کے محتاج نہیں ہیں۔

یہ حال ہے اس خاندان کا جو کم و بیش چار پشتوں سے انگریز کا باغی رہا۔ اور جس کی ایک مستقل تاریخ ہے جس کے فتووں نے ہندوستان کی مشترک تہذیب کو توانائی بخشی۔

بقیہ شری چوان

شری چوان ایک کارگزار اور کارساز وزیر ہیں۔ جب بڑے افسروں کو جنہیں سکریٹریٹ میں فراعنہ کا درجہ حاصل ہے، ہم نے شری چوان سے مرعوب دیکھا۔ افسروں کا بیان ہے کہ فائلوں پر ان کی نوٹنگ کو رد کر دینا، اور نئی نوٹنگ کرنا شری چوان کے لئے بالکل معمولی بات ہے۔

شاید یہ افشائے راز نہ ہو کہ پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں مرکزی کابینہ کے جس وزیر نے مسلم رائے عامہ کا احترام کیا، وہ مسٹر چوان تھے۔

ہندوستان کے اول درجہ کے سیاستدانوں میں ان کا شمار ہے۔ وہ چاہتے تو وزارت عظمیٰ کے امیدوار بھی ہو سکتے تھے لیکن حق یہ ہے کہ ان کی دیانت کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی ہی وزیر اعظم ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ عوام کے بہت بڑے طبقہ کی انہیں تائید حاصل ہے۔ اور اس معاملہ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ مسٹر چوان کے اس عظیم کردار کی ہمیں داد دینی چاہیے کہ ان کی انا میں کبھی سرکشی نہیں ہوئی۔

انگلینڈ کے بادشاہ چارلس ہشتم کے لئے جب موت کی سزا تجویز کی گئی اور اسے پھانسی کے تختے پر لیا گیا تو سردی کی شدت سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ چارلس نے اپنی آخری خواہش کے طور پر اوڑھنے کے لئے ایک کمبل طلب کیا۔ اس نے کہا میں قوم کی بھلائی اور بہبودی کی خاطر یہ سزا پا رہا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ سمجھیں کہ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔

مرحوم شاہ نیپال کے دادا رانا شیر جنگ بہادر لندن میں ایک شاہی ضیافت میں مدعو تھے۔ آرکسٹرا اور موسیقی کے بعد ایک شخص نے پوچھا "آپ کو ہماری موسیقی پسند آئی؟" شاہ نے کہا "ہاں" وہ [illegible] "آپ تو ہماری موسیقی سے واقف نہیں" شاہ نیپال نے [illegible] "ہاں"
شاہ نیپال نے کہا [illegible] زبان سے واقف [illegible]